Dareecha-e-Tahqeq
دریچۂ تحقیق

ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 7, Issue 1
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

Research Article

نگینہ نذیر
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، ایم۔وائی یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر محمد وسیم انجم
پروفیسر شعبہ اردو، ایم۔وائی یونیورسٹی، اسلام آباد

پاکستانی اردو انشائیہ میں داخلیت اور خارجیت کی فکری کشمکش

Nagina Nazir
Ph.D Scholar, Department of Urdu MY University, Islamabad.
Dr. Muhammad Waseem Anjum
Professor, Department of Urdu, MY University, Islamabad.

Received: Jan 02, 2026
Accepted: Jan 27 2026
Published: Mar 30, 2026

The Ideological Conflict of Subjectivity and Objectivity inPakistani Urdu Inshaia

This research article investigates the dialectical tensionbetween subjectivity *Dakhliyat* and objectivity *Kharijiyat* within the tradition of the Pakistani Urdu *Inshaia* (light essay). Rooted in the classical paradigm established by Michel de Montaigne, which prioritizes personal revelation over formal structure, the study traces the evolution of the genre in Urdu through a comparative analysis of its leading figures. The article contrasts the philosophical frameworks of two major literary movements: the Sargodha School, led by Dr. Wazir Agha, which focuses on nature, cosmic exploration, and the internalization of natural phenomena; and the Lahore School, represented by Mashkoor Hussain Yad and Nazir Siddiqui, which engages with psychological complexities, moral consciousness, and the harsh realities of modern urban life. Through the critical examination of key essayists—including Ghulam Jilani Asghar's centrifugal style, Akber Hamidi's existential synthesis, Jamil Azar's social narratives, and Nasir Abbas Nayyar's theories on the creation of meaning this study demonstrates how the *Inshaia* serves as a creative bridge. It concludes that the modern Urdu *Inshaia* is not merely an aesthetic escape but a profound intellectual discourse that uses the "internal lamp" of the writer's soul to illuminate the "external ambiguities" of a mechanical

age, thereby asserting individual freedom against societal constraints.Urdu Inshaia, Subjectivity and Objectivity, Michel de Montaigne, Sargodha School, Lahore School, Dr. Wazir Agha, Mashkoor Hussain Yad, Nasir Abbas Nayyar, Personal Essay, Psychological Realism, Existentialism in Urdu Literature, Modern Urdu Prose.

Keywords: Psychological, Illuminate, Ambiguities, Dr Wazir Agha, Urdu Inshaia

اردو نثر کی تاریخ میں انشائیہ ایک ایسی صنفِ لطیف کے طور پر ابھرا جس نے معروضی صداقتوں کے بجائے موضوعی تجربات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ اس صنف کی نظریاتی اساس اس فکری انقلاب میں پوشیدہ ہے جس نے علم کو مدرسوں اور لائبریریوں کی ثقالت سے نکال کر فرد کے باطن کی روشنی سے منور کیا۔ انشائیہ در حقیقت ایک ایسی ذہنی روش کا نام ہے جہاں ادیب خارجی دنیا کے حقائق کو من و عن بیان کرنے کے بجائے انھیں اپنی ذات کے فلٹر سے گزار کر ایک نیا تخلیقی روپ عطا کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں داخلیت اور خارجیت کی پہلی کشمکش جنم لیتی ہے اور انشائیہ نگار شعوری طور پر خارج کے مقابلے میں اپنی داخلی کائنات کو ترجیح دیتا ہے۔

اس صنف کا باقاعدہ آغاز سولھویں صدی کے فرانسیسی مفکر میشل ڈی مونتین سے ہوتا ہے، جسے عالمی ادب میں انشائیہ کا جدامجد تسلیم کیا جاتا ہے۔ مونتین نے اس وقت کی مروجہ علمی روایات، جو کہ منطق اور استدلال کے آہنی شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھیں، سے انحراف کرتے ہوئے ایک ایسے اسلوب کی بنیاد رکھی جو سراسر شخصی اور غیر رسمی تھا۔ اس نے اپنی تحریروں کو 'ایسے' (Essai) یعنی 'کوشش' یا 'آزمائش' کا نام دیا، جس کا مقصد کسی عالمگیر سچائی کو ثابت کرنا نہیں بلکہ اپنی فکری صلاحیتوں اور نفسیاتی واردات کو پرکھنا تھا۔ مونتین کے نزدیک انشائیہ مصنف کی شخصیت کا بے ساختہ اظہار ہے، جس میں وہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی خامیوں اور تضادات کو بھی اسی دیانت سے پیش کرتا ہے۔ مونتین کی داخلیت پسندی اس کے اس یقین پر مبنی تھی کہ انسان کی سب سے بڑی مہم خود اپنی ذات کی دریافت ہے۔ اس نے کائنات کے بڑے بڑے فلسفیانہ سوالات کو رد نہیں کیا بلکہ ان کے جوابات اپنے باطن کی گہرائیوں میں تلاش کیے۔

مونتین کے اس تصورِ انشائیہ نے آنے والی صدیوں میں انگریزی اور پھر اردو ادب کو گہرائی سے متاثر کیا۔ جب ہم اردو انشائیہ کے نقطہ آغاز کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی داخلیت اور خارجیت کی کشمکش ابتدا ہی سے موجود تھی۔ اردو میں انشائیہ کی اصطلاح رائج ہونے سے پہلے 'نثرِ لطیف' اور 'لطیف پاروں' کی ایک روایت موجود تھی، لیکن ان میں اکثر مقصدیت اور خارجیت کا عنصر غالب رہتا تھا۔ سر سید احمد خان نے مغربی 'ایسے' سے متاثر ہو کر اردو میں مضمون نگاری کی بنیاد رکھی، مگر ان کے مضامین زیادہ تر اصلاحی، معروضی اور خارجی مسائل کے گرد گھومتے تھے، جس کی وجہ سے ان میں وہ خالص داخلیت پیدا نہ ہو سکی جو انشائیہ کا خاصہ ہے۔

اردو میں انشائیہ کی صنف نے اپنی اصل روح کو اس وقت پایا جب ادیبوں نے خارج کے بوجھل تقاضوں سے دامن چھڑا کر اپنی شخصیت کے انکشاف کی طرف توجہ دی۔ محمد حسین آزاد کے تمثیلی مضامین اور فرحت اللہ بیگ کی شگفتہ تحریروں میں انشائیہ کے نقوش ابھرے، لیکن اسے ایک تحریک اور باقاعدہ صنف کی شکل بیسویں صدی کے وسط میں ملی۔ ڈاکٹر وزیر آغا وہ پہلی شخصیت تھے جنھوں نے شعوری طور پر انشائیہ کو مضمون کی معروضیت سے الگ کر کے اسے 'انفرادی شعور' اور 'ذاتی انکشاف' کی صنف قرار دیا۔ انھوں نے انشائیہ کے لیے انکشافِ ذات اور غیر رسمی طریقِ کار کو لازمی قرار دیا، جو در حقیقت مونتین کی داخلیت پسندی کا ہی مشرقی روپ تھا۔ اردو انشائیہ کے باقاعدہ نام اور صنف کے طور پر مستحکم ہونے کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ وزیر آغا اور مرزا ادیب نے 'ادبِ لطیف' کے صفحات سے جس تحریک کا آغاز کیا، اس نے اردو نثر کے روایتی ڈھانچے میں شکست و ریخت پیدا کی۔ اس دور میں داخلیت پسندی محض ایک فکری رجحان نہیں رہی بلکہ ایک ادبی ضرورت بن گئی تاکہ مشینی زندگی کے جبر میں فرد کی آواز کو سنا جا سکے۔ اس نقطہ آغاز اور اصطلاحی سفر کی وضاحت ڈاکٹر وزیر آغا نے ان الفاظ میں کی ہے:

"ادبِ لطیف میں 'ایسے' کو پیش کرنے کی تحریک کا آغاز ہوا تو میرے اور میرزا ادیب صاحب کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اسے کیا نام دیا جائے۔ اسی دوران میں نے کسی ادبی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا جو کسی انشا کے ٹکڑے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ میرزا ادیب صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے اور اس کے بعد سے 'ایسے' کے لیے انشائیہ کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا جو خوش قسمتی سے مقبول بھی ہو گیا۔"(1)

اس طرح اردو انشائیہ کا باقاعدہ سفر انکشافِ ذات کی اس شاہراہ پر شروع ہوا جہاں خارجیت کا کام صرف تحریک پیدا کرنا تھا، جبکہ اصل فن کی تشکیل مصنف کی داخلی بصیرت سے ہوتی تھی۔ مونتین کی داخلیت پسندی اردو انشائیہ نگاروں کے لیے ایک ایسا فکری پیمانہ بن گئی جس کے ذریعے انھوں نے انسانی نفسیات اور معاشرتی رویوں کی نئی تشریح کی۔ یہ نقطہ آغاز دراصل اردو نثر میں اس عہد کی دستک تھی جہاں ادیب نے کائنات کے عظیم بیانیوں سے ہٹ کر اپنے چھوٹے چھوٹے مشاہدات اور انوکھی ترنگوں کو فن کا درجہ دینا شروع کیا۔

اردو انشائیہ کی تاریخ میں دبستانِ سرگودھا ایک ایسے فکری دبستان کے طور پر ابھرا جس نے مادیت زدہ اور مشینی زندگی کے شور میں انسانی روح کی بازیافت کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس مکتبِ فکر کی بنیاد ڈاکٹر وزیر آغا کی زیرِ قیادت اس نظریے پر رکھی گئی کہ کائنات کی اصل سچائی خارجی مظاہر کے بوجھل بیانیے میں نہیں، بلکہ فرد کی اپنی داخلی بصیرت اور وجدان میں پوشیدہ ہے۔ دبستانِ سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے نزدیک انشائیہ محض ایک صنفِ نثر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک روحانی اور جمالیاتی مہم جوئی ہے جہاں ادیب اپنے باطن کی مشعل جلا کر کائنات کے ان دیکھے گوشوں کی سیاحت کرتا ہے۔ ان کے ہاں داخلیت (Subjectivity) ایک ایسی عینک ہے جس کے ذریعے وہ کائنات کے ذرے ذرے میں حسن اور معنویت تلاش کرتے ہیں۔

دبستانِ سرگودھا کے فکری نظام کا مرکزی نکتہ "فطرت پرستی" ہے۔ اس دبستان کے تخلیق کاروں نے شہروں کی مصنوعی چکاچوند اور میکانکی تکرار سے کنارہ کشی اختیار کر کے دیہی زندگی کی سادگی اور فطرت کے خاموش مکالمے کو اپنی فکر کا محور بنایا۔ ان کے انشائیوں میں درخت، پرندے، زمین کی خوشبو، موسموں کا تغیر اور کچے راستے محض پسِ منظر کے طور پر نہیں آتے، بلکہ یہ وہ زندہ کڑیاں ہیں جو انسان کو اس کے کائناتی مرکز سے جوڑتی ہیں۔ ان کے نزدیک فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہی وہ واحد راستہ ہے جس سے گزر کر انسان اپنے وجود کے المیوں سے نجات پا سکتا ہے اور ایک ایسی طمانیت حاصل کر سکتا ہے جو مشینی دور میں ناپید ہو چکی ہے۔

اس دبستان کی فکری تشکیل میں ڈاکٹر وزیر آغا نے "نظریہ ثنویت" کو ایک بنیادی اہمیت دی ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کے تمام مظاہر متضاد قوتوں کے ٹکراؤ اور ان کے باہمی تعامل سے عبارت ہیں۔ وہ انشائیے میں اکثر دو مختلف رویوں یا اشیاء کو آمنے سامنے لا کر ان کے تصادم سے معنی کی نئی لہریں پیدا کرتے ہیں۔ ان کا یہ دانشورانہ رویہ انشائیے کو محض تاثراتی تحریر سے بلند کر کے ایک ایسی فکری سطح پر لے آتا ہے جہاں جزو کے ذریعے کل کو جانچنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ان کی فکر میں انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان ایک ایسا توازن پایا جاتا ہے جو فرد کو کائنات کا ایک متحرک حصہ ثابت کرتا ہے۔ جمیل ملک اس فکری رویے کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"وزیر آغا کے فکر و فن میں نظریہ ثنویت کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ انشائیے کی اصطلاح میں اس نظریے کو بھی مسلسل چلتے رہنے ہی کے عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر ہمہ وقت متحرک رہنے کا یہ عمل زندگی کے تمام مظاہر کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کے بغیر ممکن نہیں۔"(2)

دبستانِ سرگودھا کے فکری ڈھانچے میں انشائیہ نگار کی حیثیت ایک "گیانی" یا "عارف" کی سی ہے جو اشیاء کی ظاہری ہیئت کو چیر کر ان کی باطنی روح تک پہنچ جاتا ہے۔ مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں میں یہ وصف نمایاں ہے کہ وہ بظاہر معمولی چیزوں کو اپنی تخلیقی نگاہ سے اس طرح چھوتے ہیں کہ وہ علامت اور استعارے کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ان کے ہاں "چھڑی" محض ایک لکڑی کا ٹکڑا نہیں رہتی بلکہ زندگی کے توازن کی علامت بن جاتی ہے اور "زیتون کی شاخ" امن اور روحانی تقدس کا مینار بن کر ابھرتی ہے۔ یہ موضوعاتی وسعت دراصل اس داخلی روشنی کا کرشمہ ہے جو خارج کے تاریک اور غیر اہم گوشوں کو منور کر دیتی ہے۔

دبستانِ سرگودھا کے ہاں عدمِ تکمیل محض ایک تکنیکی ضرورت نہیں بلکہ ایک گہرا فلسفیانہ مؤقف ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کائنات کے حقائق کبھی مکمل طور پر گرفت میں نہیں آ سکتے، اس لیے انشائیہ نگار کو چاہیے کہ وہ قاری کو کسی حتمی نتیجے کا پابند کرنے کے بجائے اسے سوالات اور امکانات کی ایک وسیع وادی میں چھوڑ دے۔ یہ تشنگی ہی قاری کو کائنات کی سیاحت پر اکساتی ہے۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں میں یہ رنگ بہت گہرا ہے، جہاں وہ ہر منظر کے پیچھے ایک نیا سوال کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان کے انشائی سفر کی فکری نوعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یاسمین لکھتی ہیں:

"اکبر حمیدی کے موضوعات اگرچہ بوقلموں اور رنگارنگ، مگر وحدتِ تاثر کی بناء پر ایک ہی خیال کی مختلف کڑیاں محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں انسان مختلف جزیروں کی سیر کرتا ہوا زندگی کے مثبت و منفی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ مظاہرِ کائنات اور ان میں موجود دیگر اشیاء کو مختلف جزیرے قرار دیتے ہیں۔"(3)

اس فکری سیاحت کے دوران دبستانِ سرگودھا کا انشائیہ نگار خود کو ایک جزیرہ تصور کرتا ہے جو زندگی کے بحرِ الکاہل سے تازہ تازہ برآمد ہوا ہو۔ وہ اپنی ذات کی پناہ گاہ میں بیٹھ کر خارجی دنیا کے شور کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن اس شور کو اپنے باطن کے سکون پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ ان کے ہاں خلوت میں انجمن کا وہ تصور ملتا ہے جہاں ادیب اپنی تنہائی کو تخلیقی قوت میں بدل دیتا ہے۔ یہ داخلیت پسندی انھیں زندگی کی تلخیوں میں بھی حُسن تلاش کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور وہ قنوطیت کے بجائے رجائیت کے علمبردار بن کر سامنے آتے ہیں۔

دبستانِ سرگودھا کا فکری نظام دراصل ایک ایسی متوازن تہذیبی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے جو ماضی کی روایات سے جڑی ہوئی ہے مگر مستقبل کے امکانات سے بھی باخبر ہے۔ ان کے ہاں سست روی کو تیز رفتاری پر ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک زندگی کا اصل لطف ٹھہر کر مناظر کو دیکھنے میں ہے، نہ کہ اندھی دوڑ میں شامل ہونے میں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور وقار پایا جاتا ہے جو قاری کو بھی سکون اور غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے۔ ان کی یہ فکری پگڈنڈی قاری کو مروجہ شاہراہوں سے ہٹا کر فطرت کے اصلی اور اچھوتے حسن کی طرف لے جاتی ہے۔

اردو ادب میں مشکور حسین یاد کی انشائیہ نگاری ایک ایسی فکری جہت کی نمائندگی کرتی ہے جہاں تخیل کی شادابی اور نفسیاتی گہرائی باہم بغل گیر نظر آتی ہیں۔ وہ

انشائیہ کو محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے انسانی شعور کی پرتیں کھولنے کا ایک موثر آلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں داخلیت کا تصور روایتی جذبات نگاری سے کہیں بلند ہے، کیونکہ وہ اپنی ذات کے مطالعے کو کائنات کی تفہیم کا زینہ بناتے ہیں۔ یاد صاحب کی فکری بنیادوں میں ان کے ذاتی المیے اور ہجرت کے جانکاہ تجربات کا گہرا دخل ہے۔ تقسیم ہند کے وقت اپنے خاندان کے بیشتر افراد کی شہادت نے ان کے لاشعور میں ایک ایسا کرب بھر دیا جو ان کی تحریروں میں سنجیدگی اور گہرائی کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی داخلیت میں ایک طرح کا وجودی کرب پایا جاتا ہے جو انھیں معاشرے کی ناانصافیوں اور انسانی رویوں کی پیچیدہ کیفیات پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اس باطنی خلفشار کو اخلاقی شعور کے سانچے میں ڈھال کر ایک نئی معنویت عطا کرتے ہیں۔

نفسیاتی بصیرت مشکور حسین یاد کے انشائی اسلوب کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ انھوں نے فرائڈ کے نظریات سے اثر قبول کرتے ہوئے انسانی جبلتوں، لاشعور کی تحریکوں اور دبی ہوئی خواہشات کو انشائیہ کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے ہاں "میں" کا استعمال محض ایک ضمیر کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ یہ اس انسانی ذہن کا نمائندہ ہے جو ہر لحہ خیر و شر کی جنگ میں مصروف ہے مشکور حسین یاد نے نفسیاتی پیچیدگیوں کو جس فنی مہارت سے بیان کیا ہے، وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ ان کے انشائیوں میں انکشافِ ذات کا عمل انسانی نفسیات کے آفاقی مظاہر کے مطالعے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس نفسیاتی اپروچ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجھے تو غزل کے بعد انشائیہ ایک ایسی صنف نظر آتی ہے جس میں انسانی نفسیات زیادہ گہرے اور بہتر طریقے سے اظہار پا سکتی ہے اور اسی لیے غزل کی مانند اس کی نفسیاتی مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔"(4)

مشکور حسین یاد کے ہاں باطن کے تضادات محض ذہنی الجھنیں نہیں ہیں، بلکہ یہ معاشرتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا عکس ہیں۔ وہ جب اپنی ذات کے خول میں سمٹنے یا پھیلنے کی بات کرتے ہیں تو دراصل وہ ان انسانی رویوں کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں جو بظاہر مثبت لگتے ہیں مگر باطن میں تکبر، انا یا خوف کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کا انشائیہ "چھوئی موئی" اس نفسیاتی تضاد کی ایک بلیغ مثال ہے جہاں انسانی انا اور کمزوری ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح انسان اپنے ہی خوف کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی اصلیت سے دور ہو جاتا ہے۔

اخلاقی شعور ان کی داخلیت کو ایک مقصد عطا کرتا ہے۔ وہ محض انکشافِ ذات کے لیے نہیں لکھتے بلکہ ان کی تحریروں کا مقصد انسانی کردار کی تطہیر ہے۔ انھوں نے قرآنی آیات اور احادیث کے حوالوں کو انشائیہ کے شگفتہ اسلوب میں اس طرح پیوست کیا ہے کہ قاری پر نصیحت کا بوجھ نہیں پڑتا بلکہ وہ خود بخود ایک فکری تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے۔ ان کے نزدیک سچی خوشی اور قلبی اطمینان اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک انسان عدل اور عقل کے راستے کو اپنا شعار نہ بنا لے۔ یاد صاحب نے اپنے انشائیوں میں قرآنی فکر کو جس طرح عصری مسائل سے جوڑا ہے، وہ اردو ادب میں ایک نادر تجربہ ہے۔ ان کے انشائی مجموعے "بات کی اونچی ذات" کے آغاز میں سورہ ابراہیم کی آیت سے موضوع اخذ کرنے کا عمل ان کے اخلاقی و دینی لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری کے متذکرہ فکری رخ پر تبصرہ کرتے ہوئے عرفانہ بی بی رقمطراز ہیں:

"اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک نئے اور اچھوتے موضوع کو انشائیہ کا عنوان بنانا اس کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات کے حوالے دے کر چھوٹے چھوٹے عام روز مرہ کے موضوعات کو پختہ فکر کے ساتھ ساتھ شگفتہ اسلوب میں پیش کرنا بھی مشکور حسین یاد کا خاصا ہے۔"(5)

مشکور حسین یاد کے ہاں نکتہ آفرینی کا عمل خشک علمی بحث کے بجائے ایک جذباتی اور روحانی واردات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ بظاہر معمولی چیزوں، جیسے شہد کا چھتا یا سرخاب کا پر، سے ایسے فلسفیانہ نتائج نکالتے ہیں جو قاری کے اخلاقی وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی داخلیت کے دریچوں سے سماج کی برائیوں کو دیکھا اور ان کا حل اپنی روح کے عرفان میں تلاش کیا۔ ان کے انشائیے محض الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح اور باطنی ترقی کا ایک مربوط فکری نظام پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کی انشائیہ نگاری اردو ادب میں اس فکری جہت کی نمائندہ ہے جو جدید صنعتی اور میکانکی دور کے پیدا کردہ وجودی کرب سے نمٹنے کا تخلیقی راستہ فراہم کرتی ہے۔ ان کے ہاں انشائیہ محض ایک ادبی صنف نہیں بلکہ ایک ایسی فکری جدوجہد کا نام ہے جہاں انسان اپنی گمشدہ حیرت اور شخصی آزادی کی بازیافت کرتا ہے۔ جدید معاشرے میں فرد جس مشینی یکسانیت اور تکرار کا شکار ہو چکا ہے، انور سدید کے انشائیے اس سے انحراف کا ایک لطیف پیرایہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا مرکزی محور اس خارجی جبر کو توڑنا ہے جو انسان کو ایک روبوٹ یا مشینی پرزے میں تبدیل کرنے پر تلا ہوا ہے۔

انور سدید اس حقیقت کا گہرا ادراک رکھتے ہیں کہ روزمرہ کے معمولات کی بیڑیوں نے انسانی روح کی تازگی کو سلب کر لیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا اصل حسن اس کی رنگارنگی اور تنوع میں ہے، جبکہ جدید تہذیب اسے اعداد و شمار اور طے شدہ اوقات کار کے آہنی شکنجے میں جکڑ رہی ہے۔ ان کے انشائیے اس گھٹن زدہ فضا سے نکل کر تخیل کی کھلی فضا میں سانس لینے کا ایک متبادل فراہم کرتے ہیں۔ وہ فرد کو اس مشینی حصار سے نفسیاتی سطح پر آزاد کروانے کی تگ و دو کرتے نظر آتے ہیں تاکہ وہ اپنی انفرادی شناخت اور تخلیقی جوہر کو دوبارہ دریافت کر سکے۔ ان کے فکری سفر کی جڑیں اس بیزاری میں پیوست ہیں جو تکرارِ عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ تکرار انسانی حسِ لطیف کو کند کر دیتی ہے اور اسے

اپنے گرد و پیش کے مظاہر سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر انور سدید کے اسی فکری رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا انشائیہ دراصل ایک نفسیاتی مراجعت کا نام ہے جو انسان کو اس کی اندرونی راکھ سے بچانے کی سعی کرتا ہے۔ ناصر عباس نیر کی رائے انور سدید کے فنی منصب کو یوں واضح کرتی ہے:

"ڈاکٹر انور سدید کا انشائیہ جیسا کہ کہا گیا ہے، بنیادی طور پر روزمرہ کی بے رنگ، تکرار آلود اور میکانکی زندگی سے نفسیاتی اور روحانی سطحوں پر آزاد ہونے کا عمل ہے۔ تکرار اور میکانکیت رفتہ رفتہ آدمی کو اندر سے راکھ کرنا شروع کر دیتی ہیں۔" (6)

انور سدید کا انشائیہ نگار خارجی دنیا کے شور و غل سے اکتا کر جب اپنے باطن کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی آزادی کا اصل دشمن کوئی بیرونی قوت نہیں بلکہ وہ خود ساختہ دیواریں ہیں جو اس نے معاشرتی ضرورتوں کے نام پر اپنے گرد کھڑی کر رکھی ہیں۔ یہ ادراک اسے ایک ایسے لمحۂ غنیمت کی طرف لے جاتا ہے جہاں جبر، اختیار میں بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک جب تک انسان اپنی داخلی دنیا کی خود مختاری کو تسلیم نہیں کرتا، وہ خارجی دنیا کے مشینی جبر کا قیدی ہی رہتا ہے۔

شخصی آزادی کے اس سفر میں انور سدید کا اسلوب ایک گائیڈ کا کام کرتا ہے جو قاری کو روزمرہ کی اشیاء کے انوکھے پہلو دکھا کر اسے حیران کر دیتا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ ایک 'فائل' یا 'مچھر' ایسے حقیر موضوعات بھی کس طرح گہری معنویت کے حامل ہو سکتے ہیں اگر انھیں مشینی نظر کے بجائے تخلیقی نگاہ سے دیکھا جائے۔ ان کے نزدیک حیرت ہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو مشین بننے سے روکتا ہے۔ جب تک انسان میں سوال اٹھانے اور شے کی نئی تعبیر کرنے کی صلاحیت باقی ہے، وہ آزاد ہے۔ ان کے انشائیہ "تاروں بھری رات" میں شخصی قید اور اس سے نجات کے عمل کو نہایت فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح فرد اپنی احتیاجوں کے بوجھ تلے دب کر کائنات کی وسعتوں کو بھول جاتا ہے، لیکن ایک لمحے کی بیداری اسے اپنی خود ساختہ قید کا احساس دلا دیتی ہے۔ اس وجودی سچائی کو وہ ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

"میں ایک ایسا زندانی ہوں جس کے چاروں طرف ضرورتوں اور احتیاجوں نے دیواریں ہی کھڑی کر دی ہیں۔ لیکن چندے اور مجبوری کا یہ احساس زائل ہو گیا اور اس کے برعکس ایک جذبہ بے اختیار ابھر آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دیواریں تو میری خود ساختہ ہیں اور میں نے خود انھیں اپنے گرد اٹھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔" (7)

یہ انکشاف کہ دیواریں خود ساختہ ہیں، دراصل شخصی آزادی کی پہلی سیڑھی ہے۔ انور سدید کے انشائیوں میں یہ سفر مادی دنیا کو ترک کرنے کا نام نہیں، بلکہ مادی دنیا کے اندر رہتے ہوئے اس سے ماورا ہو کر سوچنے کا نام ہے۔ وہ جسمانی طور پر دفتری کرسی یا سماجی بندھنوں میں جکڑے ہونے کے باوجود اپنی فکری اڑان سے ان بندشوں کو لغو ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں انشائیہ ایک ایسا "سیفٹی والو" ہے جو مشینی زندگی کے دباؤ کو کم کر کے انسانی شعور کو توازن بخشتا ہے۔

ان کے نزدیک عرفانِ ذات کا راستہ کسی جنگل یا غار کی طرف نہیں جاتا، بلکہ وہ اس داخلی کمرے میں پوشیدہ ہے جہاں انسان اپنی کتابوں، یادوں اور تخیل کے ساتھ تنہا ہوتا ہے۔ مشینی زندگی انسان کو بھیڑ کا حصہ بناتی ہے جبکہ انور سدید کا انشائیہ اسے اپنی انفرادی قامت کا احساس دلاتا ہے۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک انشائیہ نگار اپنی تخلیقی طاقت سے وقت کی جبریت اور حالات کی سنگلاخی کو موم کر سکتا ہے۔ انور سدید کی یہ فکری روش اردو انشائیہ کو ایک ایسا وقار عطا کرتی ہے جہاں ادیب محض ایک مبصر نہیں رہتا بلکہ وہ ایک ایسے مہم جو کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ناموافق خارجی حالات کے باوجود اپنی باطنی خود مختاری کا جشن مناتا ہے۔ ان کے انشائیے دراصل مشینی دور کے اس تھکے ہوئے انسان کا مینی فیسٹو (Manifesto) ہیں جو اپنے وجود کی سچائی کو تکرار کی گرد میں گم ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔ ان کا قلم قاری کو یہ پیغام دیتا ہے کہ زندگی کے کارزار میں سب سے بڑی فتح اپنی ذات کے چراغ کو روشن رکھنا ہے۔

غلام جیلانی اصغر کی انشائیہ نگاری اردو ادب میں ایک ایسی پختہ کار تخلیقی لہر کی صورت میں نمودار ہوئی جس نے خارج اور داخل کے روایتی فرق کو مٹا کر اشیاء کو ایک نئی معنوی زندگی عطا کی۔ ان کے ہاں انشائیہ محض ایک صنفِ نثر نہیں، بلکہ ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جہاں بظاہر ٹھوس اور مادی اشیاء اپنی میکانکی حقیقت کھو کر مصنف کی باطنی دنیا کا حصہ بن جاتی ہیں۔ وہ انگریزی ادب کے گہرے مطالعے اور تدریسی پس منظر کی وجہ سے اس صنف کے عالمی مزاج سے پوری طرح واقف تھے، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس غیر ملکی ہیئت کو مقامی تہذیب اور انفرادی وجدان کے ایسے رنگ عطا کیے کہ ان کی تحریر میں "قریبی گپ شپ" اور "عمیق دانش" ایک ہو گئے۔

خارجی اشیاء کی قلبِ ماہیت ان کے فن کا وہ جوہر ہے جو قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ جیلانی صاحب جب کسی عام شے، مثلاً بستر، مکان کی بنیاد یا گالی کو موضوع بناتے ہیں، تو وہ اس شے کے معروضی وجود سے بحث نہیں کرتے بلکہ اس کی مابعد الطبیعیاتی اور نفسیاتی جہتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک 'مکان' محض اینٹ گارے کا ڈھانچہ نہیں، بلکہ دھرتی سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ اشیاء کے خول کو اتار کر ان کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ وہ اشیاء مصنف کی ذات کا ہی ایک پھیلاؤ محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ان کی اس تخلیقی بصیرت کا بہترین نمونہ ان کا انشائیہ "مکان بنانا" ہے، جہاں وہ زمین کی گہرائی کو انسانی باطن کے متوازی کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح زمین کی خارجی سطح پر وقت کی یلغار انسان کو ایک حقیر تنکا بنا دیتی ہے، لیکن جب وہی انسان زمین کے بطن (بنیادوں) میں اترتا ہے، تو وہ وقت کی جبریت سے آزاد ہو کر ایک ابدی سکون اور معنویت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس فکری نکتے کو وہ نہایت خوبصورتی سے یوں بیان کرتے ہیں:

"زمین کے اندر کا سیلف اس کے باہر کے سیلف سے بالکل مختلف ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کا داخلی سیلف، آپ کے خارجی سیلف کی ضد ہے۔۔۔ جب آدمی زمین کے بطن

میں اترتا ہے تو وہ اپنے اندر کی پُراسرار معنویت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، زمین کے باہر تو ایک ایسی ناہموار سطحیت ہے جس پر چلنے سے انسان اپنے اصلی وجود سے کٹ کر زمانی تناظر میں ایک ایسا تنکا بن جاتا ہے جو انبوہ کے سیلاب میں بے یار و مدد گار بہتا چلا جا رہا ہو۔'' (8)

اسلوب کے اعتبار سے غلام جیلانی اصغر "مرکز گریز" قوت کے مالک ہیں۔ان کی فکر ایک مرکزی نکتے سے شروع ہوتی ہے لیکن وہ اس کی گرفت میں مقید رہنے کے بجائے شعوری طور پر بھٹکنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بھٹکاؤ بے مقصد نہیں ہوتا، بلکہ وہ موضوع کے گرد مختلف معاشی، سیاسی اور سماجی دائرے بناتے ہوئے قاری کو علم و دانش کی ایک ایسی دنیا کی سیر کراتے ہیں جہاں 'بچہ' 'ایک مکمل سوشلسٹ نظر آتا ہے اور 'گالی' 'جمہوریت کے فروغ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وہ موضوع کی ڈور کو ہاتھ میں رکھتے ہوئے اسے اس طرح ڈھیل دیتے ہیں کہ ان کی فکر کا پتنگ کھلی ہواؤں میں اڑتا محسوس ہوتا ہے، مگر بالآخر وہ اس تمام تر آوارہ خرامی کو واپس موضوع کے مرکز پر مجتمع کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے جیلانی صاحب کے اس انوکھے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے ایک فنی کمال قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک یہ مرکز گریزیت ہی دراصل انشائیہ نگار کی وہ فکری آزادی ہے جو اسے منطقی قید سے نجات دلا کر متنوع مداروں میں سفر کرنے کا موقع دیتی ہے۔اس اسلوبیاتی خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جیلانی صاحب کے انشائیے میں مرکز گریز قوت کا استعمال نسبتاً زیادہ ہے لیکن لمحہ بھر کے بعد اس قوت کو مرکز پر مجتمع بھی کر لیتے ہیں۔ گویا موضوع کی ڈور کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے باوجود جیلانی صاحب اسے ڈھیل بھی دیتے رہتے ہیں۔ان کے انشائیے کا پتنگ کھلی ہواؤں میں پرواز کرتا ہے اور اس عمل میں وہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی اشاروں کو انشائیے کی بنت میں شامل کرنے کی پوری کاوش کرتے ہیں۔'' (9)

جیلانی صاحب کا یہ اندازِ نگارش قاری کو کسی مخصوص نظریے کا پابند نہیں بناتا، بلکہ اسے ایک ایسی فکری جولانی عطا کرتا ہے کہ وہ خود بھی اشیاء کے نئے مفاہیم تلاش کرنے لگتا ہے۔ان کے ہاں 'بستر میں لیٹنا' محض آرام نہیں بلکہ "کارگاہِ فکر" ہے جہاں کائنات کے نئے منصوبے جنم لیتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا کی ہر شے کو اس کے مروجہ استعمال سے الگ کر کے اسے ایک علامتی وقار بخشتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں میں کہیں بھی تصنع یا آورد کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ ایک فطری بہاؤ نظر آتا ہے جو قاری کو اپنا ہم مجلس بنا لیتا ہے۔ مجموعی طور پر، غلام جیلانی اصغر کے انشائیے خارج سے داخل کے اس سفر کی روداد ہیں جہاں اشیاء اپنے معروضی وجود کو خیر باد کہہ کر تخیل کے رنگوں میں رنگ جاتی ہیں۔ان کا مرکز گریز اسلوب اردو انشائیہ کو ایک ایسی وسعت دیتا ہے جس میں پوری کائنات ایک فرد کی ذات کے اندر سمٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

اکبر حمیدی کی انشائیہ نگاری اردو ادب میں ایک ایسے فکری سنگم کی حیثیت رکھتی ہے جہاں مشاہدے کی معروضیت اور تخیل کی داخلیت باہم شیر و شکر ہو کر ایک نیا جہانِ معنی تخلیق کرتی ہیں۔ان کا ادبی سفر شاعری کی نغمگی سے شروع ہوا، جس نے ان کے نثری اسلوب کو وہ لطافت اور شعری رچاؤ عطا کیا جو ان کے انشائیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ حمیدی کے ہاں انشائیہ محض ایک صنفِ نثر نہیں ہے، بلکہ یہ "سوچ سمندر" میں غوطہ زنی کا ایک ایسا عمل ہے جہاں وہ خارجی دنیا کے جزیروں سے گزرتے ہوئے انسانی باطن کے عرفان تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ان کا فکری نظام اس حقیقت پر استوار ہے کہ کائنات کی ہر شے، چاہے وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، انسانی وجود اور اس کی نفسیاتی واردات سے گہرا ربط رکھتی ہے۔

اکبر حمیدی کا نمائندہ تصور "جزیرے" کی تمثیل میں پوشیدہ ہے۔ان کے نزدیک کائنات کے تمام مظاہر بحرِ بے کنار میں تیرتے ہوئے مختلف جزیرے ہیں۔ یہ جزیرے تنہائی کی علامت نہیں بلکہ اس کائناتی توازن کا حصہ ہیں جو تنوع میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ وہ خارجی کائنات کے ان بکھرے ہوئے جزیروں کی سیاحت کرتے ہوئے قاری کو یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح فطرت نے یکسانیت کے طلسم کو توڑنے کے لیے رنگ رنگ کے مظاہر تخلیق کیے۔ان کے نزدیک یہ دنیا بھی اس وسیع کائناتی سمندر میں ایک سرسبز و شاداب جزیرہ ہی ہے جو زندگی کی علامت بن کر ابھرا ہے۔

ان کے فکری سفر کی پہلی منزل خارجی اشیاء کا بغور مشاہدہ ہے، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس مشاہدے کو محض سطح تک محدود نہیں رکھتے۔ وہ اشیاء کی ظاہری ہیئت سے گزر کر ان کے باطن میں چھپے ہوئے اسرار کا سراغ لگاتے ہیں۔ان کے ہاں "پتنگ"، "جامن کا پیڑ"، "پرانے کپڑے" اور "کھانے کی میز" محض مادی چیزیں نہیں رہتیں بلکہ انسانی یادوں، سماجی رویوں اور وجودی سچائیوں کے علامتی پیکر بن جاتی ہیں۔ وہ خارج کی ہر حرکت کو داخل کی ایک لہر سے جوڑ دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں ایک ایسا فکری امتزاج پیدا ہوتا ہے جو قاری کے ذہنی افق کو کشادہ کر دیتا ہے۔ کائنات کی اس علامتی تشکیل کو وہ اپنے شاہکار انشائیے "جزیرے کا سفر" میں یوں بیان کرتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ سمندروں کو داغ دار بنانے کے لیے خدا نے جزیرے تخلیق کئے ہوں گے۔ پھر اُس خالقِ اکبر کو خیال آیا ہو گا کہ جزیرے تو ہر خوفناک چیز کا طلسم پاش پاش بھی کر سکتے ہیں۔ تب اس نے رات کے سمندر میں ماہتاب کا جزیرہ تخلیق کیا ہو گا۔ پھر تاریکی کے اس بحرِ بے کنار میں ستاروں کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بنائے ہوں گے۔۔۔ غور سے دیکھا جائے تو کائنات کے سمندر میں یہ ننھی سی دنیا ایک سرسبز و شاداب جزیرہ ہی تو ہے۔'' (10)

اکبر حمیدی کے ہاں "سوچ" ایک فعال اور جاندار وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ان کا انشائیہ "میں سوچتا ہوں" اس فکری نظام کی کلید فراہم کرتا ہے جہاں وہ سوچ کو ایک ایسی داخلی عدالت قرار دیتے ہیں جو خارجی ظلم و ستم کے خلاف انسان کی سب سے بڑی دفاعی قوت ہے۔ان کے نزدیک سوچنے کا عمل ہی انسان کو مشینی زندگی کی بے حسی

سے بچاتا ہے اور اسے ایک باشعور فرد کے طور پر قائم رکھتا ہے۔ وہ سوچ کے ذریعے ماضی کے تجربات کو حال کے شعور میں منتقل کرتے ہیں اور ناکامیوں یا غلطیوں کو بھی شخصیت کی تعمیر کا زینہ بناتے ہیں۔ ان کا دانشورانہ رویہ انھیں یہ سکھاتا ہے کہ مادی دنیا کی تلخیاں صرف اسی صورت میں برداشت کی جاسکتی ہیں جب انسان کا داخلی نظامِ فکر توانا ہو۔

اس باطنی عرفان کے سفر میں اکبر حمیدی انسانی شخصیت کے تضادات کو بھی بڑی فنکاری سے بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ "اندر کے آدمی" اور سماجی "پر سونا" کے مابین جاری کشمکش کو انشائیے کے لطیف پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی اصل سچائی اس کے انکشافِ ذات میں پوشیدہ ہے، جہاں وہ اپنی خامیوں اور غیر مہذب جبلتوں کو بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ اعترافِ ذات انھیں مروجہ منافقتوں سے نجات دلا کر ایک ایسی فکری آزادی عطا کرتا ہے جہاں وہ ہنستے مسکراتے ہوئے زہر کا پیالہ بھی پی سکتے ہیں اور خود کو باوقار طریقے سے دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اکبر حمیدی لکھتے ہیں:

"سوچ ایک ایسا داخلی عمل ہے جو لوگوں کو خارجی ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے۔ انھیں نہ صرف زندہ رکھتا ہے بلکہ زندہ جاوید بناتا ہے۔۔۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سوچ ہی وہ زہر ہے جو اندر ہی اندر انسان کے رگ وپے میں پھیلتا رہتا ہے اور آخر انسان اس سطح پر آجاتا ہے کہ یا تو خود اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے یا دوسروں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔" (11)

اکبر حمیدی کی رجائیت پسندی ان کے فکری امتزاج کا ایک نہایت توانا پہلو ہے۔ وہ مایوسی کے اندھیروں میں بھی "جگنو" تلاش کر لینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ ان کے نزدیک خواہشیں امیدوں کو جنم دیتی ہیں اور امیدیں وہ روشن ستارے ہیں جو انسانی زندگی کی تاریک جھاڑیوں کو منور رکھتے ہیں۔ وہ "خزاں" کو بھی زوال کی علامت نہیں سمجھتے بلکہ اسے کائنات کے تخلیقی تسلسل اور تجدیدِ حیات کا ایک لازمی مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ مثبت طرزِ فکر قاری کو یہ پیغام دیتا ہے کہ زندگی ایک مسلسل آگے بڑھنے کا نام ہے اور ناکامی صرف اس وقت ہوتی ہے جب انسان کوشش کرنا چھوڑ دے۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں دیہی سادگی اور شہری شعور کا جو سنگم ملتا ہے، وہ ان کے عصری شعور کی دلیل ہے۔ وہ ایک طرف تو "سپنوں کے گاؤں" کے نوحہ گر ہیں تو دوسری طرف شہر کے "خالی گیراج" اور "دہشت گرد" ایسے موضوعات کے ذریعے جدید تہذیب کے زوال کا نوحہ بھی پڑھتے ہیں۔ ان کا فکری سفر دراصل ان تمام بکھرے ہوئے تجربات کو یکجا کرنے کا نام ہے جو انسان کو مادی سطح سے اٹھا کر روحانی بلندیوں تک لے جاتے ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ جب ایک فنکار اپنے باطن کی روشنی میں کائنات کی سیاحت کرتا ہے، تو وہ محض ایک تماشائی نہیں رہتا بلکہ خود تماشا بن کر کائنات کے اسرار کا حصہ بن جاتا ہے۔ یعنی اکبر حمیدی کی انشائیہ نگاری خارجی مظاہر کی محض تصویر کشی نہیں بلکہ ایک ایسی فکری کیمیا گری ہے جو معروض کو موضوع میں بدل دیتی ہے۔ ان کا سفر خارجی جزیروں کے مشاہدے سے شروع ہو کر اس باطنی عرفان پر ختم ہوتا ہے جہاں پوری کائنات انسان کی ذات کے ایک گوشے میں سما جاتی ہے۔

اردو انشائیہ کی فکری تاریخ میں جمیل آذر کا نام ایک ایسے تخلیقی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اس صنف کو محض داخلی واردات اور تجریدی تصورات کی قید سے نکال کر عصرِ حاضر کی ٹھوس سماجی اور خارجی حقیقتوں سے ہمکنار کیا۔ ان کی انشائیہ نگاری دراصل اس فکری جمود کے خلاف ایک کامیاب احتجاج ہے جو انشائیہ کو زندگی کے عملی مسائل سے گریز کی صنف سمجھتا تھا۔ جمیل آذر نے ثابت کیا کہ انشائیہ نگار کا باطن اس وقت تک مکمل طور پر روشن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی خارجی دنیا کے کرب، سماجی تضادات اور تمدنی ٹوٹ پھوٹ کو اپنی تخلیقی گرفت میں نہ لائے۔ ان کے ہاں "عصری خارجیت" محض مشاہدہ نہیں، بلکہ سماجی المیوں کی ایک ایسی شخصی تعبیر ہے جو قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ ایک گہرا سماجی شعور بھی عطا کرتی ہے۔

جمیل آذر کے فکری نظام میں خارجیت کا تصور اس قدر توانا ہے کہ وہ روزمرہ کے استعمال کی معمولی مشینی اشیاء کو بھی انسانی روح کے المیوں کا استعارہ بنا دیتے ہیں۔ ان کا انشائیہ "واشنگ مشین" اردو انشائیہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں وہ ایک گھریلو مشین کے ذریعے پورے معاشرے کی باطنی غلاظت، منافقت اور اخلاقی زوال پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ وہ خارج کے اس مشاہدے کو اپنی باطنی آرزو میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ تحریر ایک آفاقی اخلاقی مطالبہ بن جاتی ہے۔ اس فکری جہت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد نے جمیل آذر کی انفرادیت کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے:

"جمیل آذر کو انشائیہ نگاروں میں اس حوالہ سے ایک منفرد حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی بار اُردو انشائیہ کو تجریدی موضوعات سے نکال کر زندگی کی حقیقی صورتوں سے آشنا کیا ہے۔" (12)

جمیل آذر کا سماجی شعور شہری زندگی کی بیگانگی اور مشینی دور کی بے حسی کو جس طرح بے نقاب کرتا ہے، وہ ان کے گہرے انسانی درد کا غماز ہے۔ ان کے نزدیک جدید شہر ایک ایسا "خوفناک آکٹوپس" ہے جو انسان کی شناخت چھین کر اسے محض ایک نمبر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انشائیہ "غیر معروف شہری" میں وہ تمدنی تصادم کی اس صورتِ حال کو موضوع بناتے ہیں جہاں انسان مادی ترقی کے ہجوم میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہ جدیدیت کے اس جبر پر خاموش رہنے کے بجائے اسے انشائیے کی شگفتگی میں ڈھال کر ایک فکری احتجاج کی صورت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شہری معاشرہ انسانی رفعت کو زر اور کھاتہ نمبروں میں تولنے لگا ہے، جو ایک بڑا تہذیبی المیہ ہے۔

جمیل آذر کے ہاں عصری خارجیت کا ایک اور پہلوان کا گہرا سیاسی ادراک ہے۔ ان کا انشائیہ "سنہری شاخ" اقتدار کی ازلی ہوس اور سیاسی عدم استحکام پر ایک بلیغ تخلیقی تبصرہ ہے۔ وہ اساطیری حوالوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عصرِ حاضر کے حکمرانوں کی نفسیات اور طاقت کے حصول کے لیے کی جانے والی خونی جدوجہد کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک باطنی جنگل کے درندے جب خارج میں اقتدار کی گدی پر بیٹھتے ہیں، تو انسانیت پامال ہونے لگتی ہے۔ سماج اور ماحول سے مواد اخذ کرنے کی اسی خوبی پر ڈاکٹر بشیر سیفی رقمطراز ہیں:

"وہ انشائیہ لکھتے ہوئے اپنے معاشرے اور ماحول کو نظر انداز نہیں کرتے، بلکہ اپنے ارد گرد کے ماحول ہی سے انشائیہ کا مواد حاصل کرتے ہیں، چنانچہ ان کے ہاں ایک اخلاقی رویہ بھی نظر آتا ہے۔" (13)

ان کے انشائیوں میں "تانگہ کلچر" اور "ریلوے پلیٹ فارم" ایسے موضوعات محض ماضی پرستی نہیں، بلکہ اس بدلتی ہوئی تہذیب کا مرثیہ ہیں جس میں انسانی رشتوں کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔ جمیل آذر تانگے کی سست روی اور گھوڑے کی ٹاپوں میں اس موسیقی کو تلاش کرتے ہیں جو جدید ٹریفک کے بے ہنگم شور میں گم ہو چکی ہے۔ وہ خارج کے ان مناظر کے ذریعے قاری کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہم ترقی کی دوڑ میں اپنی وہ تہذیبی شناخت کھو رہے ہیں جو ہماری روح کا حصہ تھی۔ ان کی تحریروں میں خارجیت ایک ایسے آئینے کی طرح ہے جس میں وہ قاری کو اس کے اپنے عہد کا بکھرا ہوا چہرہ دکھاتے ہیں۔

ان کے فن کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ سماجی المیوں کو بیان کرتے ہوئے بھی مایوسی کی دلدل میں نہیں گرتے۔ ان کی رجائیت پسندی انھیں اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ خارج کی بدصورتی کو بھی اپنی تخلیقی بصیرت سے خوبصورتی میں ڈھال دیں۔ انشائیہ "واشنگ مشین" کے اختتام پر ان کا فکری رویہ اپنی پوری تابندگی کے ساتھ سامنے آتا ہے، جب وہ معاشرے کی تطہیر کی تمنا کرتے ہیں:

"میں سوچتا ہوں کاش میرے گھر کے باہر کوئی ایسی واشنگ مشین نصب ہو جائے، جس میں سے گزر کر معاشرے کے سارے غلیظ اور بدبودار پیراہن صاف ستھرے اُجلے اور سپید ہو جائیں۔ روحوں پر سے صدیوں کی جمی ہوئی میل اُتر جائے اور دلوں سے بغض اور کینہ اور منافقت کی بساند دھل جائے۔" (14)

جمیل آذر کے انشائیے جدید انسان کے اس داخلی اور خارجی تصادم کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جس میں وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ انھوں نے انشائیہ کو اس قابل بنایا کہ وہ ہائیڈ پارک کی تنقیدی بحثوں سے لے کر ریٹائرمنٹ کے بعد کی بے چارگی تک، ہر انسانی صورتِ حال کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ خارج کے ہر زخم کو داخل کی پٹی سے مرہم لگاتے ہیں، جس سے ان کی تحریروں میں ایک ایسی شفا بخش شگفتگی پیدا ہوتی ہے جو اردو انشائیہ میں کم یاب ہے۔ جمیل آذر نے عصری خارجیت کو انشائیہ کی فنی نزاکتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس صنف کو ایک نیا وقار عطا کیا۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کی انشائیہ نگاری اردو ادب میں ایک ایسے فکری سنگم کی حیثیت رکھتی ہے جہاں تنقیدی بصیرت اور تخلیقی وجدان ایک دوسرے میں ضم ہو کر شعور کے نئے افق دریافت کرتے ہیں۔ ان کا شمار انشائیہ نگاروں کی اس نئی نسل میں ہوتا ہے جس نے اس صنف کو محض ذاتی تاثرات کی محدود دنیا سے نکال کر جدید عالمی فکریات، بالخصوص ساختیات اور پسِ ساختیات کے تناظر میں ایک نئی معنویت عطا کی۔ ناصر عباس نیّر کے ہاں انشائیہ محض ایک تحریر نہیں بلکہ خارج کے ابہام اور کائنات کی پُراسرار خاموشی کے مقابل انسانی داخلیت کا وہ چراغ ہے جو ناموجود کو موجود بنانے اور اوجھل گوشوں کو منور کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ ان کے فکری نظام کا نقطہ آغاز "معنی کی تخلیق" کا وہ تصور ہے جو اقبال کے "چراغ آفریدم" کے فلسفے سے مستعار ہے۔ ان کے نزدیک خارجی دنیا اپنے آپ میں مبہم اور بے معنی ہے؛ یہ انسان کی داخلی بصیرت اور اس کا تخلیقی لمس ہے جو کائنات کے بکھرے ہوئے مظاہر کو معنویت کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ وہ ادب کی دیگر اصناف کو "آئینہ" قرار دیتے ہیں جو پہلے سے موجود حقیقت کو منعکس کرتی ہیں، جبکہ انشائیہ ان کے لیے "چراغ" کی مانند ہے جو اندھیرے میں روشنی پیدا کر کے نئی حقیقتیں خلق کرتا ہے۔ یہ فکری برتری داخلیت کو خارجیت پر وہ تفوق عطا کرتی ہے جو جدید انشائیہ کی روح ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے نزدیک انشائیہ انسانی شرف کا سب سے بڑا محافظ ہے کیونکہ یہ انسان کو ایک "خالق" کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ ان کے نزدیک شرفِ انسانی کا پرانا تصور، جو تسخیرِ کائنات پر مبنی تھا، اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ جدید دور میں انسان کی بڑائی اس بات میں ہے کہ وہ اپنی ایک متوازی کائنات تخلیق کر سکے اور یہ تخلیقی عمل انشائیہ کے ذریعے ہی بہترین طور پر انجام پاتا ہے۔ اپنی اس فکری اساس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ "چراغ آفریدم" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

"غور کریں تو انشائیہ واحد صنف ادب ہے جو صحیح معنوں میں شرف انسانی کی ترجمان اور محافظ ہے۔ پیش نظر رہے کہ شرف انسانی کا کلاسیکی مفہوم اب باقی نہیں رہا جس کی رُو سے انسان اس لئے افضل ہے کہ وہ باقی مخلوقات کو مطیع اور مغلوب کر سکتا ہے یا ستاروں پہ کمند ڈال سکتا ہے۔۔۔ اب انسان کا اصل شرف یہ سمجھا جا رہا ہے کہ وہ خود اپنی ایک کائنات تخلیق کر سکتا ہے۔" (15)

ان کے انشائیوں میں خارجیت کا ابہام اس وقت دور ہوتا ہے جب انشائیہ نگار کی داخلیت اشیاء کی ظاہری سطح کو چیر کر ان کے بطون تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ وہ

"معنی" کو کوئی ایسی جامد شے نہیں سمجھتے جو کسی کتاب یا ہادی سے بنی بنائی صورت میں حاصل ہو جائے، بلکہ ان کے نزدیک معنی ایک "زندہ اور سانس لیتا ہوا تجربہ" ہے جو فرد کے باطن سے پھوٹتا ہے۔ ان کا انشائیہ "معنی" اسی فکری جہت کا شاہکار ہے، جہاں وہ قاری کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ کائنات میں اپنے حصے کی روشنی خود پیدا کرنی پڑتی ہے۔ یہ داخلیت پسندی انھیں روایتی مصلحین سے ممتاز کرتی ہے جو بنے بنائے جوابات دینے پر اصرار کرتے ہیں۔

ناصر عباس نیّر کی انشائیہ نگاری میں تجسیم نگاری کا اسلوب خارج کے ابہام کو مٹانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ وہ مجرد تصورات، جیسے 'خواہش' یا 'تنہائی'، کو انسانی پیکر عطا کر کے انھیں حسیاتی سطح پر محسوس کراتے ہیں۔ ان کے ہاں داخلیت کی روشنی جب کسی خارجی شے پر پڑتی ہے تو اس کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ وہ بظاہر حقیر نظر آنے والی چیزوں، مثلاً چیونٹیوں یا ایک پرانے کمرے، کو بھی فلسفیانہ معنویت کا ایسا لبادہ پہناتے ہیں کہ قاری ان معمولی اشیاء میں کائنات کے بڑے حقائق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ یہ اسلوبیاتی ہنر مندی ان کے تنقیدی شعور کا ہی تخلیقی پرتو ہے۔ ان کے فن کی اس خصوصیت کو ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی شدت سے محسوس کیا کہ ناصر عباس نیّر کس طرح "فرشِ خاک" سے اشیاء کو اٹھا کر انھیں جھاڑ پونچھ کر معنویت کے آسمان تک لے جاتے ہیں۔ وزیر آغا کے نزدیک نیّر کا انشائیہ نقادوں کے لیے بھی ایک دعوتِ فکر ہے کہ وہ ظاہری چمک دمک کے بجائے ان پوشیدہ لعلوں کی تلاش کریں جو سادہ تحریروں کی گودڑیوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان کے اس کمالِ فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے انشائیے پڑھیں تو آپ کو معمولی چیزوں اور افعال میں ایک جہانِ معنی نظر آئے گا۔ صنفِ انشائیہ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ ان گری پڑی چیزوں کو فرشِ خاک سے اٹھا لیتی ہے جنھیں ہماری ادبی اشرافیہ نے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا تھا اور پھر انھیں جھاڑ پونچھ کر کیا سے کیا بنا دیا ہے۔'' (16)

ان کے انشائیوں میں "تنہائی" اور "خاموشی" ایسے موضوعات محض نفسیاتی کیفیات نہیں ہیں بلکہ یہ خارج کے شور کے مقابل داخلیت کی پناہ گاہیں ہیں۔ وہ جب خارج کے ہنگاموں سے اکتا جاتے ہیں تو اپنے باطن کے "کمرے" میں پناہ لیتے ہیں، جہاں وہ اپنی ذات کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک نئی وحدت تخلیق کرتے ہیں۔ یہ عمل دراصل خارج کے ابہام پر داخلیت کی فتح کا اعلان ہے۔ ان کے نزدیک انشائیہ نگار کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کے لامتناہی پھیلاؤ میں فرد کے وجود کا جواز تلاش کرے اور اسے معنویت کے چراغ سے منور کرے۔

مختصراً یہ کہ ناصر عباس نیّر کی انشائیہ نگاری خارج کے ابہام کو مٹانے اور داخلیت کی روشنی میں نئے معنی تخلیق کرنے کا نام ہے۔ ان کا قلم ایک ایسے معمار کا قلم ہے جو تخیل کی اینٹوں سے فکر کی وہ عمارت تعمیر کرتا ہے جہاں فرد کی ذات کائنات کے عرفان کا مرکز بن جاتی ہے۔ ناصر عباس نیّر نے انشائیہ کو محض ایک ادبی صنف کے طور پر نہیں برتا بلکہ اسے ایک وجودی مہم جوئی بنا دیا ہے جہاں ہر جملہ ایک دریافت اور ہر نکتہ ایک بصیرت ہے۔ ان کے ہاں داخلیت اور خارجیت کا تصادم کسی نتیجے پر پہنچ کر رک نہیں جاتا بلکہ ایک مسلسل مکالمے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پاکستانی اردو انشائیہ اپنی فکری اور اسلوبیاتی بنت میں داخلیت اور خارجیت کے ایک نہایت فعال اور تخلیقی تصادم کا مظہر ہے۔ اس مفصل مطالعے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ جہاں دبستانِ سرگودھا نے انکشافِ ذات، کائناتی مظاہر کے داخلی ادراک اور فطرت کے ساتھ صوفیانہ ہم آہنگی کو اپنی فکر کی اساس بنایا، وہیں دبستانِ لاہور نے عصرِ حاضر کی معروضی تلخیوں، سماجی ناہمواریوں، نفسیاتی گرہوں اور مشینی زندگی کے جبر کو انشائیے کے قالب میں ڈھال کر اسے ایک نئی دانشورانہ معنویت عطا کی۔ یہ کشمکش اردو انشائیہ نگاروں کے لیے محض ایک فنی تجربہ نہیں رہی، بلکہ اس نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنی انفرادی لہروں کو اجتماعی شعور کے سمندر کے ساتھ ہم آہنگ کر سکیں۔ اس فکری دوئی نے انشائیہ کو ایک طرف غزل جیسی حریری لطافت اور رومانوی شگفتگی سے مالا مال کیا، تو دوسری طرف اسے ایک ایسی استدلالی توانائی اور تنقیدی بصیرت دی جس نے اردو نثر کے روایتی و منطقی ڈھانچے کو توڑ کر فکر و نظر کے نئے اچھوتے جزیرے دریافت کیے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مونتین کی قائم کردہ شخصی انشائیے کی کلاسیکی روایت نے پاکستانی انشائیہ نگاروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایک نئی تہذیبی اور آفاقی جہت اختیار کر لی ہے۔ داخلیت کی روشنی اور خارجیت کے ابہام کے مابین یہ مسلسل فکری مکالمہ انشائیے کی اس لچکدار اور سیال فطرت کا ثبوت ہے جو کسی ایک جامد تعریف یا متعین پیمانے میں مقید ہونے سے انکاری ہے۔ یہ صنف آج اپنے عہد کے پیچیدہ وجودی سوالات، نفسیاتی تضادات اور سماجی المیوں کا سب سے معتبر اور شائستہ تخلیقی بیانیہ بن چکی ہے، جہاں مصنف کا "میں" محض ایک فرد کی آواز نہیں رہتا بلکہ پوری انسانیت کا ترجمان بن کر ابھرتا ہے۔ اردو انشائیہ کی یہ متحرک روایت اس بات کی ضمانت ہے کہ جب تک انسانی باطن کا چراغ روشن ہے اور خارج کی بدلتی حقیقتوں کو پرکھنے کا متجسس جذبہ بیدار ہے، یہ صنف اپنی لازوال تازگی اور تخلیقی توانائی کے ساتھ انسانی شعور کو نئے علمی و وجدانی مداروں کی سیر کراتی رہے گی۔

حوالہ جات

1. وزیر آغا، ڈاکٹر، کچھ انشائیہ کے بارے میں (مضمون) مشمولہ: اُردو زبان (سالنامہ)، سرگودھا، مئی جون، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۳
2. جمیل ملک، ادبی منظر نامے، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1996ء، ص 315

3. یاسمین،ڈاکٹر،اکبر حمیدی کاانشائی سفر، مشمولہ: جرنل آف ریسرچ(اردو)، شمارہ29، شعبہ اردو،جی سی یونیورسٹی،لاہور،جون2016ء،ص118
4. سلیم اختر،ڈاکٹر،انشائیہ کی بنیاد،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،1986ء،ص213
5. عرفانہ بی بی، مشکور حسین یاد کی تخلیق و تنقیداتِ انشائیہ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،اسلام آباد،2020ء، ص 119
6. ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،"ڈاکٹر انور سدید کی انشائیہ نگاری"، مشمولہ:سہ ماہی 'روشنائی'، مدیر:احمد زین الدین، کراچی، شمارہ18،جولائی تا ستمبر2004ء،ص248
7. انور سدید،ڈاکٹر،ذکراس پری وش کا،مکتبہ جدید پریس،لاہور،1982ء،ص76
8. غلام جیلانی اصغر،پروفیسر،نرم دم گفتگو،بک لینڈ پبلشرز،لاہور،1996ء،ص30
9. انور سدید، غلام جیلانی اصغر کی انشائیہ نگاری، مشمولہ: ماہنامہ اوراق،لاہور، شمارہ33،خاص نمبر، مئی جون1983ء،ص34
10. اکبر حمیدی، جزیرے کا سفر، مکتبہ فکروخیال،لاہور،1985ء،ص20
11. ایضاً،ص86
12. رشید امجد،ڈاکٹر، پیش لفظ، مشمولہ:رت کے مہمان، مقبول اکیڈمی،لاہور،1992ء،ص10
13. بشیر سیفی،ڈاکٹر، جمیل آذر کے انشایئے، مشمولہ:نوائے وقت،راولپنڈی، 1دسمبر1996ء
14. جمیل آذر، شاخ زیتون، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا،1981ء،ص29
15. ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،چراغ آفریدم،بیکن بکس،ملتان، طبع دوم،2014ء،ص07
16. وزیر آغا،ڈاکٹر،فلیپ مشمولہ:چراغ آفریدم از ناصر عباس نیر،بیکن بکس،ملتان،2014ء